صبر وتحمل کے بعد مسلمانوں کے فیصلہ کن جواب کا وقت

ڈاکٹر سیّد احمد قادری

مرکز

تجزیہ

میں حکومت سازی کے لئے ہونے والے 18 ویں لوک سبھا کا انتخاب کا پہلا مرحلہ طے ہو چکا ہے اب بقیہ 6 مراحل باقی ہیں اور جس طرح پہلے مرحلہ میں سیکولرازم پر یقین رکھنے والے اور ملک کے آئین و جمہوریت کی بقا کے لئے رائے دہندگان نے حق رائے دہی کا زبردست مظاہرہ کیا ہے، توقع ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ بقیہ 6 مراحل میں ہوش اور جوش وخروش کا مظاہرہ کریں گے۔ ملک کے مسلمانوں کے لئے تو یہ انتخاب نہ صرف آئین وجمہوریت کے تحفظ بلکہ خود اپنے تحفظ اور اپنے تشخص کی بقا کا مسئلہ ہے۔ اس لئے اس بار ملک کے مسلمان یقینی طور پر اپنی سیاسی شعور وفہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی کی بھی جذباتی تقاریر اور سیاسی ہتھکنڈوں کا شکار نہیں ہوں گے اور ہر اس سیکولر امیدوار کو کامیاب بنائیں گے جو بی جے پی یا اس کے حلیف پارٹی کے امیدوار کو شکست فاش دینے کا اہل ہو۔ ملک کے مسلمان بلا شبہ آج بھی اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ اگر متحد ہو کر کسی ایک سیکولر امیدوار کو یکمشت ووٹ دے دیں تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔ بس دشمنوں اور دوست نما دشمن کی شاطرانہ چال کو سمجھنے اور اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ کئی انتخابی حلقوں میں جہاں مسلمانوں کی فیصلہ کن تعداد ہے وہاں سے کئی مسلم امیدوار دانستہ طور پر یا سازش کے تحت کھڑے کر دئے جاتے ہیں تا کہ مسلمانوں کا ووٹ بکھر جائے اور متعصب وفرقہ پرست امیدوار کامیاب ہو جائے۔ ان حالات میں دشمنوں اور دوست نما ایسے دشمنوں کی ایسی ہی شاطرانہ چال کو اس بار سمجھنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے بھی کہ اس بار کا یہ انتخاب کئی لحاظ سے نہ صرف بہت اہم ہے بلکہ اس انتخاب میں اگر ایک بار پھر فرقہ پرست اور ہندوتوا کے ایجنڈے کو نافذ کرنے والے کامیاب ہوتے ہیں تو پھر جیسا کہ پورے ملک کے دانشوران اور سیاسی تجزیہ کار بتا رہے ہیں کہ یہ ملک کا آخری انتخاب ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات میں ملک کے ہر فرد کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ ملک کی سالمیت کے لئے نیز خود کے تحفظ کے لئے بہت سنجیدگی سے فکر کرے۔ یہ فکرمندی ملک کے لوگوں کے ساتھ ساتھ بیرون ممالک کے دانشوروں اور سیاسی مبصرین کو بھی ستا رہی ہے۔ جرمنی، امریکہ اور اقوام متحدہ موجودہ حکومت کے انتخابی طرز عمل پر مسلسل تنقید کر رہا ہے اور اس امر کا اظہار کر رہا ہے کہ جمہوریت میں حزب اختلاف کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہئے۔ بھارت کو جہاں جمہوریت کی ماں کہا جاتا ہے وہیں یہاں جمہوریت کی پامالی عام ہے۔ امریکہ، جرمنی اور اقوام متحدہ نے تو بھارت کے اقلیتوں کے حقوق کی پامالی پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے یہاں تک کہا ہے کہ مذہبی آزادی کا احترام اور قانون کے تحت تمام شہریوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جانا جمہوریت کے بنیادی اصول ہیں۔ افسوس اس بات کی ہے کہ اس ملک کے موجودہ حکمراں کو ناقص جمہوریت کا ذمہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ تاناشاہ تک بتایا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ایک ترجمان نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس انتخاب میں توقع ہے کہ لوگوں کے سیاسی اور شہری حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اور اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے گا کہ ہر کوئی آزادانہ اور منصفانہ ماحول میں ووٹ ڈال سکے۔ اقوام متحدہ کے ترجمان کے اس بیان پر وزیر خارجہ ایس جے شنکر نے مسترد کرتے اور اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اقوام متحدہ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ملک میں انتخابات کیسے آزادانہ اور منصفانہ ہونے چاہئیے۔ بیرون ممالک کے اٹھتے ایسے سوالات کے جواب سے قبل ہمارے وزیر خارجہ کو یہ بات سمجھنی چاہئے کہ آخر اس ملک میں ایسا کیا ہو رہا ہے کہ اقوام متحدہ، امریکہ اور جرمنی وغیرہ کو ایسے بیانات دینے پر مجبور ہونا پڑا؟ گزشتہ 10 برسوں میں ملک کے مسلمانوں کے ساتھ جس طرح آمرانہ، ظالمانہ، جابرانہ، وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا وہ بلا شبہ حد درجہ تشویشناک اور پریشان کن ہے اور ان دس برسوں میں بلا شبہ ملک کے مسلمانوں نے بڑے صبر وضبط اور تحمل کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ ملک کے مسلمانوں نے ہمیشہ دفاعی پوزیشن اختیار کیا ہے کبھی بھی جارح یا حملہ آور نہیں ہوئے۔ بد سے بدتر حالات میں بھی مسلمانوں نے صبر وتحمل کا دامن نہیں چھوڑا۔ ملک کے مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح سے حکومت اور اس کے واضح اشاروں پر سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی، تعلیمی اور صنعتی طور پر کمزور، بے وقعت کئے جانے کی دانستہ کوششیں کی گئیں۔ رام مندر، لوجہاد، گھر واپسی، گئو مانس، گئو رکشا، جے شری رام، وندے ماترم، 370 کا خاتمہ، طلاق ثلاثہ، مسلم پرسنل لاء، شہریت ترمیمی قانون، یونیفارم سول کوڈ اور حجاب وغیرہ کے نام پر مسلسل مسلمانوں کو نہ صرف خوف ودہشت میں مبتلا کیا گیا بلکہ بات بات پر انھیں اور ان کے اسلام مذہب کو مغلظات سے نوازا گیا، کھلی جگہوں پر نماز کی ادائیگی میں زدوکوب کیا گیا، سجدے کی حالت میں جوتوں سے ٹھوکریں ماری گئیں اور ہماری خاموشی اور ہمارے صبر وتحمل کو ہماری کمزوری تصور کیا گیا، جو کہ پوری طرح غلط ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہم مسلمان اپنی ذلالت ورسوائیوں کا خون کے گھونٹ پیتے رہے۔ فرقہ پرست اور متعصب حکومت دراصل 'مسلم مکت بھارت' کا نعرہ دے کر اسے شرمندہ تعبیر کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور وہ ملک کی اکثریت کو یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ تقسیم ہند کے بعد یہاں کے مسلمانوں نے اپنا مسلم ملک حاصل کر لیا ہے اس لئے انھیں یہاں رہنے کا حق نہیں ہے۔ اب دیکھئے کہ آسام کے وزیر اعلیٰ ہیمنت بسوا سرما بھی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ تین دنوں میں گوہاٹی کو میاں مسلموں سے خالی کرا دیں گے، جس کے جواب میں آل انڈیا ڈیموکریٹک فرنٹ کے صدر بدرالدین اجمل نے جواب دیا تھا کہ میاں مسلموں کو تین سال کیا تین سو سال میں بھی ہٹانا ممکن نہیں ہے۔ ویسے اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ دن بدن ملک میں مسلمانوں کے لئے زمین تنگ کرنے کی عملی کوششیں اب شدت اختیات کرتی جا رہی ہیں۔ یہ ہیمنت بسوا سرما ہو، یا یتی نرسمہا ہو یا پرگیا سنگھ یا یوگی ہو، ان جیسے سینکڑوں بدزبان اور متعصب اور منافرت پھیلانے والے لوگ یا پھر فرقہ پرست تنظیمیں مثلاً بجرنگ دل، شیو سینا (شنڈے گروپ)، وشو ہندو پریشد، درگا واہنی، ہندوستانی یووا ہندو دل، رام سینا، رام چرتر سینا، ہندو وراٹھ سینا، ہندو یووا جاگرن منچ، ہندو سینا، اکھنڈ بھارت سمیتی، ہندو جاگرن سمیتی وغیرہ ایسی باتیں یونہی نہیں کہتے بلکہ مسلمانوں کو اشتعال دلانے کے لئے اور اکثریت سے متنفر کرنے کے لئے ایک ایجنڈہ کے تحت کہتے ہیں۔ ایسے مشکل، سخت اور ناگفتہ بہ حالات میں اگر ہم اب بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر سیاسی بصیرت کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں تو پھر یہ یقین رکھیں کہ ہماری داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس انتخاب میں ہندوستان کے مسلمان وقت اور حالات کے تقاضوں کو بہت سنجیدگی سے سمجھیں اور ہمت، حوصلے، جرأت کے ساتھ نامساعد حالات کے تدارک اور مصائب کے سدّ باب کے لئے اپنے سیاسی شعور فہم وفراست، دانشورانہ، عالمانہ، مدبرانہ حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک کے آئین میں دئے گئے اقلیتوں کے حقوق کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ ہم اس وقت بھی بلا شبہ اس پوزیشن میں ہیں کہ اگر ہم اپنے قیمتی ووٹوں کی قدر و قیمت کو بخوبی سمجھیں اور ان کا بھرپور استعمال کریں تو یقینی طور پر ہماری حیثیت کنگ کی نہیں تو کنگ میکر کی ضرور ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ملک میں ہم دوسری بڑی اکثریت ہیں اور ہم ملک کے طول وعرض میں اپنی آبادی پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ ملک کے پارلیمنٹ کی تقریباً ایک سو ایسی سیٹیں ہیں جہاں مسلمانوں کی قابل قدر اور فیصلہ کن آبادی ہے۔ ملک کی 65 پارلیمانی سیٹیں تو ایسی ہیں جہاں مسلمانوں کی تعداد اوسطاً 35 فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ ان پارلیمانی سیٹوں میں صرف اتر پردیش میں 14 سیٹیں ہیں، اسی طرح بنگال میں 13 سیٹیں، جموں وکشمیر میں 5، کیرل میں 8، بہار میں 4، آسام میں 7، مدھیہ پردیش میں 3، تلنگانہ میں 2، ہریانہ میں 2، تامل ناڈو میں 1، دہلی میں 2، مہاراشٹر میں 2، گوا میں 2 سیٹیں ہیں۔ اب دیکھئے کہ 2011 کی مردم شماری کے مطابق ملک میں مسلمانوں کی کل آبادی 14 فیصد مانا گیا ہے۔ اگر ہم اس اعداد وشمار کو اس وقت تسلیم بھی کر لیں تو بھی اس تناسب سے لوک سبھا میں ہماری کم از کم 64 مسلم ممبر پارلیمنٹ کی نمائندگی ہونی چاہئے، لیکن افسوس کہ ہماری ناعاقبت اندیشی، انتشار، عدم اتحاد واتفاق اور سیاسی بصیرت کی کمی نیز بعض دوست نما دشمنوں کی مفاد پرستی اور عین انتخاب کے وقت برساتی سیاسی مینڈکوں کے سیاسی مفادات کے باعث مسلم ممبر پارلیمنٹ کی تعداد گھٹ کر 4 فیصد سے بھی کم ہو گئی ہے۔ ایک وقت تھا کہ جب ملک کے پارلیمنٹ میں ہماری تعداد 49 (1980) تک تھی جواب گھٹ کر 22 (2014) اور 27 (2019) تک پہنچ گئی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی ہے کہ ملک کے مسلمانوں کی پامالی یا انھیں حاشیہ پر ڈالنے کی کوشش اس لئے بھی کامیاب ہو رہی ہے کیونکہ پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں ہمارے مسلم نمائندوں کی سخت کمی واقع ہو رہی ہے جس کی وجہ سے ملک کے مسلمانوں کے مصائب اور مسائل پر سوال نہیں اٹھائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے مسائل اور مصائب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم پارلیمنٹ میں اپنی خاطر خواہ یا اپنی آبادی کے تناسب میں نمائندے کس طرح بھیجیں۔ اس کے لئے یہ ضرور ہے کہ ہم صرف اپنے بوتے پر پارلیمنٹ میں اپنی تعداد نہیں بڑھا سکتے ہیں بلکہ اس کے لئے ہمیں ہر حال میں ملک کی سیکولر پارٹیوں سے اتحاد واشتراک ضروری ہے۔ ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ ملک کی تقریباً ہر سیاسی پارٹی کو مسلمانوں کے ووٹوں کی ضرورت ہے یہاں تک کہ بی جے پی بھی مسلمانوں سے ہر طرح کی دشمنی کے باوجود خواہش رکھتی ہے کہ اسے مسلم ووٹ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ بی جے پی نے مسلمانوں سے شدید نفرت کے باوجود اب تک کی اطلاع کے مطابق کیرالہ میں ایم عبدالسلام، مغربی بنگال سے سومترا خان اور جموں سے غلام علی کھٹانہ کو ٹکٹ دیا ہے۔ بی جے پی کی ہمنوائی کرنے والوں میں ایسے نام نہاد مسلمانوں کی بھی کمی نہیں ہے جو اپنے سیاسی اور ذاتی مفادات کے لئے بی جے پی اور بی جے پی کے لیڈران کی ''مسلم دوستی'' کی باتیں بڑی بے شرمی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں جو چند نام اس وقت ذہن میں آ رہے ہیں وہ ہیں سید شہنواز حسین، مختار عباس نقوی، ایم جے اکبر، ظفر الاسلام، دانش آزاد انصاری، محسن رضا، عارف محمد خاں، امام عمر احمد الیاسی، طارق منصور وغیرہ۔ سیاسی طور پر حاشیہ پر ڈالے جانے کے باوجود مختار عباس نقوی اور سید شہنواز حسین وغیرہ جیسے لوگ مسلسل ملک کے مسلمانوں کے ساتھ دغا کر رہے ہیں اور یہ کہتے نظر آ رہے ہیں کہ 'مودی اور بی جے پی کی طرف ملک بھر کی مسلم کمیونٹی میں زبردست جھکاؤ ہے'۔ افسوس کہ اب اسی صف میں جنتا دل (یو) یعنی نتیش کمار کی سربراہی میں چلنے والی اور خاصی متنازعہ سیاسی پارٹی کے ایک '' مسلم لیڈر'' خالد انور جو نتیش کمار کی مہربانی سے قانون ساز کاؤنسل کے ممبر بھی ہیں۔ انھوں نے تو چاپلوسی کی انتہا کر دی کہ نتیش کمار کی کامیابی کے لئے ایک جھوٹا اور بے بنیاد بیان دے کر امارت شرعیہ، جمعیۃ علما، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، کئی خانقاہ اور ملّی تنظیموں کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچانے میں کوئی عار نہیں محسوس کیا اور ان مسلم تنظیموں کی جانب سے این ڈی اے اور جے ڈی یو کی حمایت کا بیان دے دیا۔ جس کے جواب میں ان ساری تنظیموں نے اس بیان کو مسترد کرتے ہوئے ان کے اس اقدام کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ دراصل ہماری آستین کے سانپ ہیں اور اس وقت پورے ملک کے مسلم علاقوں میں ایسے سانپ طرح طرح کے روپ میں نظر آ رہے ہیں، جو مسلم ووٹوں کے بکھراؤ کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس لئے ہمیں ایسے دوست نما مسلم دشمنوں کو پہچاننے اور ان سے بچ کر رہنے کی ضرورت ہے، ورنہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پائیں گے۔

> **کئی انتخابی حلقوں جہاں مسلمانوں کی فیصلہ کن تعداد ہے وہاں سے کئی مسلم امیدوار دانستہ طور پر یا سازش کے تحت کھڑے کر دئے جاتے ہیں تا کہ مسلمانوں کا ووٹ بکھر جائے اور متعصب وفرقہ پرست امیدوار کامیاب ہو جائے۔ ان حالات میں دشمنوں اور دوست نما ایسے دشمنوں کی ایسی ہی شاطرانہ چال کو اس بار سمجھنے کی سخت ضرورت ہے۔**

(کالم نگار سینئر صحافی اور معروف ادیب ہیں)

squadri806@gmail.com

اقوال زرّیں

دولت

☐ دولت حاصل کرنا مشکل نہیں اسے خرچ کرنا مشکل ہے ☐ دولت دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے ☐ علم کی دولت سب سے بڑی دولت ہے ☐ وہ دولت نہیں جو ذلت کی راہ سے حاصل ہو ☐ سب سے اچھی دولت وہ ہے جو اپنی کوشش سے حاصل ہو ☐ انسان کی ساری دولت اس کی خوبیاں ہیں ☐ اگر دولت مندوں میں انصاف اور مفلسوں میں قناعت ہوتی تو دنیا سے گدائی کی رسم اٹھ جاتی ☐ اگر کوئی دولت کے پیچھے بھاگے تو لوگ اسے حریص کہتے ہیں ☐ اگر کوئی دولت سمیٹ کر رکھے تو سرمایہ دار کہلاتا ہے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا
ROZNAMA RASHTRIYA SAHARA LUCKNOW

پولنگ کا کم ہوتا رجحان

لوک سبھا

انتخابات میں کون ہاف ہوگا اور کون صاف ہوگا، کس کی بھاری اکثریت سے جیت ہوگی اور کس کو شکست فاش ہوگی، سیاسی پارٹیاں دعوے خواہ کچھ کریں، یہ تو طویل 7 مراحل کے انتخابات کے بعد 4 جون کو ووٹوں کی گنتی کے دن ہی پتہ چلے گا۔ فی الحال 19 اپریل کو ملک کی 21 ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی 102 سیٹوں کیلئے ہوئی پہلے مرحلہ کی پولنگ کے دوران پچھلے انتخابات کے مقابلہ میں کم ووٹ پڑنے سے جہاں سیاسی پارٹیوں کی دھڑکنیں بڑھ گئی ہیں، وہیں سیاسی مبصرین کو بھی اندازہ لگانے میں پریشانی ہو رہی ہے۔ کم پولنگ کا رجحان ایک دو سیٹوں پر نہیں، بلکہ تقریباً تمام سیٹوں پر رہا۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے انتخابات کے تئیں رائے دہندگان میں بھی دلچسپی کم ہے، یا اپنے مسائل کے حل کے سلسلہ میں وہ سیاسی پارٹیوں سے مایوس نظر آ رہے ہیں۔ ناگالینڈ کے 6 اضلاع میں تو ایک بھی ووٹ نہیں ڈالا گیا۔ وہاں کے 4 لاکھ ووٹروں کے ساتھ ساتھ 20 ممبران اسمبلی نے بھی انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ راجستھان میں 25 مقامات پر ملک کے دیگر حصوں میں بھی بائیکاٹ کی خبریں ہیں۔ بائیکاٹ کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی کہ ان کے مطالبات پورے نہیں کئے جا رہے ہیں اور وہ مایوس ہو چکے ہیں، جس کے بعد انہوں نے انتخابات کے بائیکاٹ جیسے بڑے قدم اٹھائے۔ اس وقت ملک میں انتخابات کا ماحول ہے۔ سیاسی پارٹیوں، لیڈروں اور کارکنوں میں جتنا جوش وخروش پایا جا رہا ہے اور بڑے بڑے لیڈران ایک ایک دن میں الگ الگ ریاستوں کے 3-3 اور 4-4 شہروں میں انتخابی جلسے، ریلیاں اور روڈ شو کر رہے ہیں، تو رائے دہندگان میں اتنی ہی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ لوگوں کا جھکاؤ کس طرف ہے، کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ کیا اپنے لوگ خوش فہمی میں ووٹ نہیں ڈال رہے ہیں یا عام لوگوں کی ووٹ دینے میں دلچسپی کم ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ صورت حال اس وقت ہے، جب پورے ملک میں ووٹنگ کا وقت بڑھا کر صبح 7 بجے سے شام 6 بجے تک 9 گھنٹے کر دیا گیا ہے، جس سے پولنگ کا تناسب بڑھنا چاہئے، لیکن اس میں کمی آ رہی ہے، جو تشویش کی بات ہے۔ سیاسی پارٹیوں، لیڈروں، سرکاروں اور الیکشن کمیشن کو اس طرف سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے، کیونکہ اب لوگ ووٹ دینے کی اپیلوں پر کم توجہ دے رہے ہیں۔

لوک سبھا انتخابات کے پہلے مرحلہ میں جہاں لکشدیپ میں سب سے زیادہ 83.9 فیصد پولنگ ہوئی تو وہیں بہار کے نوادہ میں اس کے نصف 43.8 فیصد پولنگ ہوئی، جو بہت زیادہ کا فرق ہے۔ اسباب بیان کر کے یا تاویل کر کے اس فرق کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ گرمی کی وجہ سے رائے دہندگان پولنگ مراکز پر نہیں پہنچ سکے۔ یہ تاویل خود کی تسلی کیلئے ہو سکتی ہے۔ پولنگ مراکز پہلے کی طرح اب دور دور نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ گرمی میں یہ پہلا الیکشن نہیں ہو رہا ہے۔ اگر پچھلے عام انتخابات سے موازنہ کیا جائے تو اسی نوادہ میں 2014 میں 52.2 اور 2019 میں 49.7 فیصد ووٹ پڑے تھے۔ اس وقت بھی گرمی کا موسم تھا۔ پولنگ کے رجحان میں مسلسل گراوٹ آنا نہ تو ملک، نہ جمہوریت اور نہ لوگوں کے حق میں صحیح ہے۔ اس بار کم ووٹنگ والے حلقوں میں صرف نوادہ ہی نہیں، بلکہ الموڑہ، کرولی۔ دھولپور، گیا، گڑھوال، جموئی، اورنگ آباد، جھنجھنو، ٹہری گڑھوال اور بھرت پور بھی شامل ہیں۔ جن حلقوں میں پولنگ 70 فیصد سے زیادہ ہوئی، وہاں بھی سابقہ انتخابات کے مقابلہ میں کم پولنگ ہوئی ہے۔ اس لئے اطمینان کی بات کہیں نہیں ہے۔ پولنگ کے رجحان میں کمی ہر جگہ نظر آ رہی ہے، جس کو بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ جمہوریت میں عوام کے پاس فیصلہ کا سب سے بڑا حق ووٹ کی صورت میں ہے، اگر وہ اس کا بھی ٹھیک سے استعمال کرنا تو دور استعمال ہی نہیں کرتے ہیں، تو لمحہ فکریہ ہے۔ پہلے مرحلہ میں مجموعی طور پر پولنگ 60 فیصد سے اوپر تو پہنچ گئی، جو پچھلے انتخابات میں 70 فیصد تھی اور سبھی جانتے ہیں کہ پولنگ کم ہوتی ہے تو عوامی رجحان کا پتہ نہیں چلتا۔ کس کو ووٹ پڑے اور کس کو نہیں پڑے، اس کا اندازہ لگانا سبھی کیلئے مشکل ہوتا ہے۔ پولنگ کا تناسب بڑھنے اور کم ہونے سے نتائج پر کتنا اثر پڑتا ہے، ماضی کا ریکارڈ بھی کچھ ایسا رہا ہے کہ کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے۔ شاید اسی لئے سیاسی مبصرین خاموش ہیں۔ انتخابی سروے پر بھی پابندی ہے۔ اس لئے ہوا کے رخ کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا۔

edit2sahara@gmail.com

اسرائیل کے خلاف ایرانی ردعمل اور عرب دنیا کا دیوالیہ پن

ڈاکٹر محمد ضیاء اللّٰہ

اسرائیل

منظر نامہ

کی حیثیت مشرق وسطیٰ میں اس مصنوعی انسانی پتلے جیسی ہو گئی ہے جس کو کسان اپنے کھیتوں میں لگا دیتے ہیں تا کہ اس کو دیکھ کر پرندے فصل سے دور رہیں اور نقصان سے اس کو بچائے رکھیں، لیکن جس دن کوئی جرأت مند اور آزاد منش پرندہ اس پتلے تک پہنچنے کی ہمت جٹا لیتا ہے اور اس کے کھوکھلے پن کے راز سے پردہ اٹھا دیتا ہے اس دن کے بعد سے نہ تو فصل محفوظ رہتی ہے اور نہ ہی کسان کی تدبیریں کام آتی ہیں اور آخر کار رزق میں جس پرندہ کا جو حصہ مالک کائنات نے متعین کیا ہے وہ اس کو حاصل کر ہی لیتا ہے۔ اسرائیل پر 'طوفان الاقصیٰ' مشن کو جب سے فلسطین کے جاں بکف مجاہدوں نے کامیابی کے ساتھ مکمل کیا ہے تب سے اس کی فریب کن قوت کے اس غبارہ کی ہوا نکل گئی ہے جس کے ڈر سے اس خطہ کے تمام عرب ممالک سہمے سہمے نظر آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 7 اکتوبر کا دن تاریخ میں ہمیشہ جلی اور روشن حروف میں لکھا جاتا رہے گا اور اس پر بے شمار کتابیں اور تحقیقی مقالے لکھے جائیں گے اور دنیا کی شاید ہی کوئی دفاعی نظام کے لئے مختص تعلیم گاہ ایسی باقی رہے گی جہاں اس کے تمام پہلوؤں پر بحث نہیں ہوگی۔ اسی طرح 13 اپریل کی تاریخ بھی نہایت اہمیت کی حامل سمجھی جائے گی کیونکہ اسی تاریخ کو ایران نے پہلی بار اسرائیل پر 300 سے زائد میزائلوں اور ڈرونز سے حملہ کر کے اس صہیونی ریاست کو واضح پیغام بھیج دیا تھا کہ اس کی جارحیت اور غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکت کو مزید برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایران نے اس حملہ کے ذریعہ اپنے اس حق دفاع کا استعمال کیا تھا جس کی اجازت بین الاقوامی قانون دیتا ہے۔ ایران کا یہ جوابی حملہ اس پس منظر میں آیا تھا کہ اسرائیل نے دمشق میں واقع ایرانی قونصلیٹ کو نشانہ بنا کر بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی تھی جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا آیا ہے۔ ایرانی قونصلیٹ پر ہوئے اس اسرائیلی حملہ میں 7 ایرانی افسران اور سفراء جاں بحق ہو گئے تھے جن میں محمد رضا زاہدی جیسے ایرانی انقلابی گارڈ کے اعلیٰ اہلکار بھی شامل تھے۔ ایران نے اسرائیل پر کئے گئے اس جوابی حملہ کا نام 'آپریشن وعدہ صادق' رکھا تھا۔ غالباً اس میں اس وعدہ کی جانب اشارہ ہو جس کا ذکر امام علی خامنہ ای نے اپنے عید الفطر کے خطبہ میں کیا تھا۔ انہوں نے اپنا خطبہ اس بار کسی عصاء پر ہاتھ رکھ کر دینے کے بجائے ایک بندوق کو ہاتھ میں پکڑ کر دیا تھا جس سے صاف اشارہ مل گیا تھا کہ اسرائیلی جرائم کا بدلہ جلد ہی لیا جائے گا، حالانکہ حملہ میں شدت اتنی نہیں تھی جس کی توقع ان علامات کی وجہ سے کی جا رہی تھی، لیکن پھر بھی اس ایرانی حملہ کے بعد لگاتار اس پر بحث جاری ہے کہ کیا یہ حملہ مؤثر تھا یا بس اس کی حیثیت محض نورہ کشتی کی تھی؟ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ماضی قریب میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہو جس کے بارے میں اتنی متضاد باتیں سامنے آئی ہوں تو غلط نہیں ہوگا۔ سوشل میڈیا کے عہد میں اس تضاد کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا ہے اور اس بحث میں تجزیہ نگار، تحقیق کاروں، سیاسی وعسکری ماہرین سے لے کر عام فالوورز تک سبھی شامل ہو گئے ہیں۔ البتہ اس پورے معاملہ میں عرب دنیا کے ممتاز تجزیہ نگاروں اور افکار و آراء سے متعلق اپنی تحریریں اخبارات ورسائل میں شائع کرنے والوں نے جو کچھ کہا ہے اس کو سمجھنا بڑا دلچسپ رہے گا۔ اسرائیل کے خلاف کئے جانے والے اس ایرانی حملہ پر جو ردعمل ان عرب دماغوں کی جانب سے آیا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حالات وواقعات کے بارے میں ان کی سمجھ بہت سطحی اور ناپختہ ہے۔ مذکورہ عرب ردعمل کا پہلا نقص تو یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کا تجزیہ فرقہ وارانہ رنگ کے ساتھ شروع کیا گیا اور بتدریج نا سمجھ نوجوانوں کی صحافت سے پرے باتوں کے درجہ تک پہنچ گیا۔ اس ردعمل میں اس حملہ کے سیاسی یا عسکری نتائج کے بارے میں گہری فہم کا شدید فقدان پایا جاتا ہے۔ انہوں نے کبھی اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ ایران جیسے آزاد صاحب سیادت ملک کے اپنے کیا حقوق واختیارات ہیں جن کے استعمال کا ان کو پورا حق ہے۔ بعض تجزیہ نگاروں کی سطحیت تو اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے ایرانی حملہ کو واہیات اور ڈرامہ ہی قرار دیا ہے اور ان کے بس میں جو کچھ تھا ان سب کا استعمال صرف اس نقطہ کو ثابت کرنے میں لگا دیا ہے۔ گویا کہ اس حملہ کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ اس سے بھی بڑھ کر ان عرب تجزیہ نگاروں اور سوشل میڈیا کے ارباب رسوخ نے اپنی توانائی اس ایرانی حملہ کے سلبی پہلوؤں کو گنانے میں صرف کی ہے۔ بعض لوگوں نے ایرانی ردعمل کو بس اس قدر کریڈٹ دینا گوارہ کیا ہے کہ اس کا اثر محض وقتی ہوگا اور تھوڑی دیر کے لئے غزہ سے توجہ ہٹ جائے گی۔ جہاں تک خود اہل غزہ کا تعلق ہے تو وہ اس ایرانی حملہ سے سب سے زیادہ خوش ہوئے کیونکہ 7 اکتوبر کے بعد پہلی بار ایسا ہوا کہ غزہ کی فضاء میں اسرائیلی جنگی طیارے منڈلاتے نظر نہیں آئے۔ مزید یہ کہ اہل غزہ کو نفسیاتی سکون ملا کہ علامتی طور پر ہی سہی لیکن وہ محاذ پر اکیلے نہیں ہیں۔ بعض عربیوں کے ردعمل سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ ان کے بقول ایرانی حملہ کا سلبی پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے معا بعد امریکہ ومغرب نے اسرائیل کو پوری قوت کے ساتھ دوبارہ مدد فراہم کرنا شروع کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہر طرح کا امریکی ومغربی تعاون اسرائیل کے لئے تھما کب تھا؟ امریکہ و مغرب نے تو اتنی بھی اخلاقی جرأت نہیں دکھائی کہ غزہ پر جاری مظالم کے بارے میں کم سے کم صہیونی روایت پر پورے طور پر بھروسہ نہ کرتے اور مظلومین کی باتوں کو بھی قابل اعتناء سمجھ کر ان کے دردوکرب میں مزید اضافہ کا سبب نہ بنتے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ صہیونیوں کی ہر بات امریکہ نے مان لی جبکہ اہل غزہ کی ہر بات کو پوری بداخلاقی سے ناقابل اعتبار گردان دیا۔ ایرانی حملہ کے بعد بہت سے عرب صہیونی بھی اسی نہج پر چلتے نظر آئے اور انہوں نے صہیونی روایت کو خوشی خوشی قبول کر لیا۔ یہ عرب صہیونی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے فکری دیوالیہ پن اور سستی کی وجہ سے حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کی کیونکہ ان عرب صہیونیوں کا تعلق اس خیمہ سے ہے جو اس نظریہ کے حامی ہیں کہ مسئلہ فلسطین سے برائے نام کا بھی واسطہ نہ رکھا جائے اور اسرائیل کے ساتھ ہر قسم کا رشتہ جوڑ لیا جائے۔ یہ عرب صہیونی اس قدر بے ضمیر اور امت کے دائرہ سے باہر جا چکے ہیں کہ وہ اسرائیل کا دفاع خود صہیونیوں سے بڑھ کر کرتے ہیں اور اگر کبھی اس صہیونی ریاست کے خلاف کوئی طاقت اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور امت کے دل وضمیر کو جگانے کی کوشش کرتی ہے تو عرب صہیونی سب سے پہلے شور مچا کر اور ان کی تنقیص کر کے ان کو بے حیثیت بنانے کی کوشش سب سے پہلے کرتے ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان عرب صہیونیوں کے اندر سب سے زیادہ نفرت یا تو تحریک مزاحمت حماس کے خلاف پائی جاتی ہے یا پھر ایران کے خلاف زہر افشانی کرتے ہیں باوجود اس کے کہ ایران نے ہمیشہ مسئلہ فلسطین کی حمایت کی ہے اور آج بھی وہی جماعتیں مسئلہ فلسطین کی حمایت میں پیش پیش ہیں جن کو ایران نے مزاحمت کی قوت کے طور پر اس خطہ میں تیار کیا ہے تا کہ مغربی استعمار کے پروجیکٹ کو مشرق وسطیٰ میں مزید پھیلنے سے روکا جائے۔ اس کے برعکس عرب ممالک نے زبانی بیانات اور مذمت کے کھوکھلے الفاظ سے سے زیادہ کچھ بھی پیش نہیں کیا ہے۔ یہ عرب صہیونی کہتے ہیں کہ اسرائیل پر اس حملہ کا کوئی اثر نہیں تھا حالانکہ ایران کے حملہ کا اتنا خوف تھا کہ اسرائیل کی حمایت میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی یہاں تک کہ بعض عرب ممالک بھی اتر آئے، جن میں اردن اور سعودی عرب کا نام تو بین الاقوامی میڈیا میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اگر یہ حملہ اتنا بے اثر تھا تو امریکہ نے چین سے لے کر سعودی عرب اور انقرہ تک ہر ایک سے گزارش کیوں کی کہ ایران کو روکا جائے؟ ان عرب صہیونیوں کو جا کر اسرائیل کے یہودیوں اور صہیونیوں سے پوچھنا چاہئے کہ ایرانی حملہ کے وقت ان کے من میں کونسا سوال گردش کر رہا تھا۔ کیا صہیونیوں کے دل ایک لمحہ کے لئے یہ سوچ کر خوف سے کپکپا نہیں گئے ہوں گے کہ اگر امریکہ ومغرب کی حمایت نہ ملی ہوتی تو ان کا کیا حشر ہوتا؟ اسی طرح اگر ایران کا یہ حملہ اتنا بے وقعت تھا جس کا دعویٰ یہ عرب تجزیہ نگار کر رہے ہیں تو پھر ایران کے سفراء کو الگ الگ مغربی ملکوں نے بلا کر حملہ کے خلاف اپنا احتجاج کیوں درج کروایا؟ بے وقعت معاملہ پر اتنا ہنگامہ تو کبھی نہیں کیا جاتا۔ اگر ایران کا حملہ غیر موثر ہوتا تو اسرائیل اس کو روکنے کے لئے تقریبا ڈیڑھ ارب ڈالر کا نقصان کیوں اٹھاتا؟ امریکہ و برطانیہ وغیرہ کے جو اخراجات ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اس کے برعکس ایران کو محض ساڑھے تین کروڑ ڈالر اس آپریشن کے لئے خرچ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ جہاں تک ایرانی حملہ کے بارے میں مغرب کے دوہرے معیار کا تعلق ہے تو اس کو سمجھنے کے لئے برطانوی وزیر خارجہ ڈیوڈ کیمرون کا وہ انٹرویو دیکھنا چاہئے جو اس نے اسکائی نیوز کو اس حملہ کے بعد دیا ہے۔ اس انٹرویو میں اینکر نے جب پوچھ لیا کہ اگر برطانیہ کے سفارت خانہ کو کسی نے حملہ کر کے زمیں بوس کر دیا ہوتا تو برطانیہ کا جواب کیا ہوتا؟ کیمرون نے فوراً کہا کہ ایسی حالت میں برطانیہ کا جواب بہت سخت ہوتا۔ اینکر نے کہا کہ یہی جواب تو ایران نے دیا ہے تو کیمرون کو سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سوال کا جواب کیسے دیا جائے۔ دراصل کیمرون یہ بتانا چاہتے تھے کہ ایسی حالت میں برطانیہ کے لئے پیمانہ مختلف ہوگا اور ایران کے لئے بالکل مختلف۔ اسی دوہرے معیار کے تحت چند اسرائیلی یہودیوں کی خاطر پورے غزہ اور وہاں کے انسانوں کو تباہ کر دیا گیا، لیکن مغرب کے غیر انسانی اور غیر اخلاقی پیمانہ کی وجہ سے اسرائیل کے ظلم کو مسلسل روکا نہیں گیا اور اب غزہ کے ساتھ ساتھ صہیونی قتل کی مشین رفح تک میں تباہی اور قتل وخون کا بازار گرم کر رہی ہے، لیکن کوئی قانون اس پر نافذ نہیں ہو رہا ہے۔ اس پورے واقعہ میں رونا صرف اس بات کا ہے کہ عرب معاشرہ اپنا کردار نبھانے میں بری طرح ناکام رہا ہے اور اس کی تلافی کے بجائے ظالموں کا حامی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریخ کے اوراق میں انہیں جو جگہ ملے گی وہ کسی بھی طرح ان کے لئے باعث عزت نہیں ہوگی بلکہ عار وشنار کا داغ ہی ان کے حصہ میں آئے گا۔ اس لئے ان کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ ایران کی اہمیت گھٹانے کے بجائے اپنا وقار اور اپنی عظمت رفتہ کو بحال کرنے پر توجہ دیں تا کہ مزید رسوائی کا سامنا انہیں نہ اٹھانا پڑے۔

> **اسرائیل پر 'طوفان الاقصیٰ' مشن کو جب سے فلسطین کے جاں بکف مجاہدوں نے کامیابی کے ساتھ مکمل کیا ہے تب سے اس کی فریب کن قوت کے اس غبارہ کی ہوا نکل گئی ہے جس کے ڈر سے اس خطہ کے تمام عرب ممالک سہمے سہمے نظر آتے تھے۔**

(مضمون نگار سینٹر فار انڈیا ویسٹ ایشیا ڈائیلاگ کے وزیٹنگ فیلو ھیں)

مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

سوشل میڈیا نے سماجی زندگی تباہ کردی

مکرمی! اللہ تعالیٰ نے جب سے یہ کائنات بنائی ہے تب سے انسان کے سیکھنے کا عمل جاری وساری ہے۔ انسان اپنے گھر اور ماحول سے سیکھتا ہے لیکن دَور حاضر میں سیکھنے کا یہ عمل کافی آسان ہو گیا ہے۔ موبائل فونز اور انٹرنیٹ صارفین کا دو تہائی سے زائد حصہ سوشل میڈیا کا استعمال کر رہا ہے۔ اس سہولت کی بدولت ہر شخص کو اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ ہمیں دَور حاضر میں اس سے خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ سوشل میڈیا اس قدر طاقتور میڈیم ہے کہ دنیا کے کسی کونے میں موجود شخص سے آپ کی ملاقات کروا سکتا ہے اور آپ کو آپ کے خاندان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ان سے دور کر سکتا ہے۔ ہماری اور آپ کی ہتھیلیوں پر اور انگوٹھے کے نیچے معلومات کا ایک طوفان برپا ہے۔ اکثر اوقات یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کہاں کلک کرنا ہے اور کہاں نہیں کرنا۔ کیوں کہ آپ کا ایک کلک آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو ایک نئی دنیا میں لے جاتا ہے، جہاں آپ چند لمحے گزار کر، جب واپس اپنی دنیا میں آتے ہیں تو یہ بھید کھلتا ہے کہ یہاں تو کئی گھنٹے بیت چکے ہیں۔ فی زمانہ سوشل میڈیا ایک ایسی لت بن چکا ہے، جس میں بچوں سے لے کر بوڑھوں تک سب گرفتار ہیں۔ ماہرین کے نزدیک لت کی تعریف یہ ہے کہ کوئی بھی ایسا عمل، جس کو کرنے سے آپ کی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور آپ یہ بات جاننے کے باوجود اس عادت کو ترک کرنے سے قاصر ہیں۔ دنیا کے مایہ ناز ماہرین میں سے ایک ڈاکٹر گیبر میٹ کی ریسرچ کے مطابق ہر لت کسی نہ کسی ذہنی دھچکے سے متعلق ہوتی ہے۔ زندگی میں ملنے والی کوئی بھی ناکامی انسان کو کسی نہ کسی لت میں مبتلا کرتی جاتی ہے۔ جب کسی کو کوئی جذباتی دھچکا پہنچتا ہے تو وہ اپنے جیسے کسی دوسرے انسان کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ معاشرتی حیوان ہونے کے ناطے انسان کی جبلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے رابطہ قائم کرے۔ سماجی رابطے کے برقی صفحات سے مسلسل رابطہ جوڑے رکھنے اور ان برقی صفحات کے بغیر رہ نہ پانے کو لت کا نام دیا جاتا ہے۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ سماجی رابطے کے برقی صفحات کا استعمال کرنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد کے لیے ان برقی صفحات کا استعمال ایک نشہ بن چکا ہے۔ اس برقی دور میں جہاں ہر چیز برق رفتاری سے اسکرین کا حصہ بنتی جا رہی ہے، وہیں جذبات، احساسات اور خیالات بھی برقی صفحات کا حصہ بن چکے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایموجیز کی مدد سے اپنے احساسات کا اظہار کرنے والی نسل کی زبانوں سے اصل الفاظ کی چاشنی گم ہو چکی ہو۔ کوئی مر رہا ہے تو ویڈیو، کوئی مار رہا ہے تو ویڈیو، آپ نے کیا کھایا، کیا خریدا، کیا پہنا، کہاں گھومنے گئے، کس سے ملے، کس کے ساتھ وقت گزارا۔ ہر لمحہ سیلفی کی فکر میں جیتے لوگ اتنی زندگی جی نہیں رہے، جتنی زندگی کیمرے میں قید کر رہے ہیں۔ کتنے لائیکس، کتنے کمنٹس، کتنے شیئرز کی گنتی میں الجھ کر اپنی اصل قیمت کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ خود پسندی اور ریاکاری کا شکار انسان 5 ہزار دوستوں کی لسٹ میں بھی تنہائی کا شکار رہتا ہے۔ ایک حالیہ مطالعے کے مطابق بار بار اپنی سیلفی لینا ایک ذہنی خلل ہے، جسے سیلفیٹس (selfitis) کہا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کوئی شخص اگر ایک دن میں چھ سے زیادہ مرتبہ اپنی سیلفی لیتا ہے اور اسے سوشل میڈیا پر پوسٹ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ذہنی خلل بہت زیادہ ہے۔ سوشل میڈیا پر ہر 10 میں سے تین تصاویر سیلفی ہوتی ہیں۔ انسٹاگرام پر ہر 10 سیکنڈ میں ایک ہزار سیلفیاں پوسٹ کی جاتی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق روزانہ دنیا بھر میں 93 ملین سیلفیاں لی جاتی ہیں۔ ایک دور تھا کہ علما کی جانب سے ویڈیو اور تصویر کشی کو حرام کہا جاتا تھا اور اس کی شدید مخالفت کی جاتی تھی۔ مذہبی رہنماؤں میں سے چند ایک اب بھی اس کے مخالف ہیں، لیکن ان کی تعداد شاید اب آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ اکثر علما ومشائخ نے معاشرے کی ضروریات کے باعث اسے جائز قرار دے دیا ہے۔ ویڈیو اور تصویر کشی اب خود اسلام کی تبلیغ کا ایک اہم راستہ بن چکا ہے، لیکن اس کی آڑ میں ہم نے وہ کچھ کر دیا ہے جس کے اخروی انجام کا شاید ہمیں اندازہ بھی نہ ہو۔ ابتدا تو یوں ہوئی کہ ہم احساس کمتری کا شکار ہوئے اور اپنی زندگی کے روشن پہلوؤں کو سوشل میڈیا پر شیئر کرنے لگے تا کہ دنیا ہمیں اشرافیہ میں شمار کرے۔ اہل کیمرہ کہیں کھانا کھانے جاتے تو سوشل میڈیا پر اس کی تشہیر کرتے، کسی بڑی شخصیت سے ملتے جو ان کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا، لیکن احساس کمتری کے شکار افراد اسی حالت میں ان کے ساتھ تصویر بنوانا اور اسے سوشل میڈیا پر شیئر کرنا قابل فخر سمجھنے لگے ہیں۔ ان تمام کاموں سے معاشرتی برائیاں جنم لے ہی رہی تھیں کہ ہم میں سے، بہت زیادہ لوگوں نے اپنی عبادات کی بھی تشہیر کرنی شروع کر دی۔ تہجد جیسی عبادت جسے رات کے پہر کرنے کا حکم ہی اس لیے تھا کہ یہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان راز ہے۔ اہل موبائل اور سوشل میڈیا کے دیوانوں نے اسے بھی مشتہر کرنا شروع کر دیا جس سے بظاہر نمود ہی جھلکتی ہے جو کہ خود ایک گناہ ہے۔

ندیم خان، بارہمولہ، کشمیر

نوٹ: ادارتی صفحے پر شائع مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

کہتا ہوں مگر جو بھی وہ کرتا تو نہیں ہوں
''ہوں وعدہ فراموش میں ایسا تو نہیں ہوں''
دیوانہ بنا رکھا ہے کرسی کی طلب نے
لوگو! یہاں فنکار میں تنہا تو نہیں ہوں

جاوید مشیری

سہارا انڈیا ماس کمیونی کیشن کیلئے پرنٹر و پبلشر **ضیاء قادری** نے سہارا انڈیا ماس کمیونی کیشن پریس، سہارا انڈیا ٹاور، 7 کپورتھلہ کمپلیکس، علی گنج لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا۔
Printed & Published by **Zia Qadri**, on behalf of **Sahara India Mass Communication** and Printed & Published at **Sahara India Mass Communication Press**, Sahara India Tower, 7 Kapoorthala Complex, Aliganj Lucknow
Editor & Group Editor: **Abdul Majid Nizami** (editor.nizami@gmail.com) Resident Editor: **Dr. Himayat Hussain Jaisi** (himayatsahara@gmail.com) * ایڈیٹر اینڈ گروپ ایڈیٹر: عبدالماجد نظامی ■ ریزیڈنٹ ایڈیٹر: ڈاکٹر حمایت حسین جائسی
For Editorial/News: simeurdu@gmail.com, ■ Advertisement (National): ■ 9891773434, 9899452476 Email: adsahara@gmail.com
فون لکھنؤ دفتر: پی بی ایکس وایڈیٹوریل: 0522-2332935, 2323126, 2337777 انٹرکام: 5367 سرکولیشن: 2388379، شعبہ اشتہارات: 0522-2376356، ای میل: simeurdu@gmail.com - (Lucknow) sime.urdulko@gmail.com ٹیلی فون: دہلی آفس 23352368,23352369,
* اس شمارہ میں شائع شدہ تمام خبروں کے انتخاب اور ایڈیٹنگ کیلئے ذمہ دار
R.N.I. No 70390/99 ROZNAMA RASHTRIYA SAHARA (LUCKNOW) شمارہ: 8882 سال: 25
روزنامہ راشٹریہ سہارا
○ حب الوطنی ○ فرض شناسی ○ ایثار
ہمیں فخر ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں